

باب 5

لکھنؤ میں اردو شاعری



13085CH05

1707 میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت زوال کا شکار ہو گئی۔ بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار کی وجہ سے یہاں کی معاشی صورت حال بد سے بدتر ہوتی گئی۔ مجبوراً یہاں کے شعراء ادا با اور دوسرے ارباب فضل و کمال مختلف پناہ گاہیں ڈھونڈنے لگے۔ اس زمانے میں دہلی کے برخلاف اودھ میں خوش حالی تھی۔ یہاں کے صوبے دار برہان الملک سعادت علی خاں تھے، جنہوں نے فیض آباد کو دارالسلطنت بنا کر بڑی حد تک خود مختاری حاصل کر لی تھی۔ ان کے بعد صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کا دور دورہ رہا۔ اس کے بعد آصف الدولہ نے یہاں کی حکومت سنبھالی۔ انہوں نے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ ان کی سخاوت کا ہر طرف شہرہ تھا اس لیے دوسرے ارباب کمال کے ساتھ اردو کے شعرا بھی پہلے فیض آباد پھر لکھنؤ میں جمع ہوتے گئے۔ اس طرح لکھنؤ شعر و ادب کا ایک مرکز بن گیا۔ آصف الدولہ کے بعد غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر اور آخر میں واجد علی شاہ کے عہد تک لکھنؤ کی مرکزی حیثیت برقرار رہی۔

فیض آباد اور پھر لکھنؤ میں شعرو سخن کی بساط جمانے والوں میں وہ شعرا پیش پیش تھے جو دہلی اور اس کے اطراف سے ہجرت کر کے وہاں پہنچے تھے جیسے سودا، میر تقی میر، میر حسن، جرات، مصحفی، رنگین، انشا وغیرہ۔ اس کے بعد اگلی نسل ان شعرا کی تھی جو یہیں پلے بڑھے اور استادی کے درجے تک پہنچے۔ ان میں ناسخ اور آتش سرفہرست ہیں۔ ان کے بعد ناسخ کے شاگردوں میں وزیر، رشک، بحر وغیرہ اور آتش کے شاگردوں میں نسیم، صبا، رند، شوق وغیرہ نے لکھنؤ کی شعری روایت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

لکھنؤی شعرا نے صنف مرثیہ کی طرف بھی توجہ کی اور اسے درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ مرثیہ گو شعرا میں خلیق و ضمیر اور انیس و دیر نے خاص طور پر شہرت حاصل کی۔ بعد میں آوج، مولس، انس، عشق، وحید وغیرہ نے مرثیہ گوئی کی اس روایت کو جاری رکھا۔ ’ریختی‘ کی بنیاد بھی لکھنؤ ہی میں پڑی۔ انشا، رنگین، جان صاحب نے اس میں شہرت پائی۔ ’واسوخت‘ میں بھی یہاں نئی نئی راہیں نکالی گئیں۔ امانت کا نام اس باب میں سرفہرست ہے۔ لکھنؤ میں شعر و ادب کے مطالعے کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلا دور

لکھنؤ میں اردو شاعری کا پہلا دور دہلی کے طرز پر ہی شروع ہوا جس میں سادگی اور صداقت پسندی کو اہمیت حاصل تھی۔ تاہم رفتہ رفتہ لکھنؤ کی شاعری نے اپنی الگ شناخت قائم کی۔ زبان و بیان اور لب و لہجے میں تبدیلی کے علاوہ افکار و تصورات میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ آہستہ آہستہ رنگینی، تکلف اور تصنع کو اہمیت حاصل ہوتی گئی۔ پہلے دور سے تعلق رکھنے والے شعرا میں مصحفی، جرأت، انشا، رنگین اور شاہ نصیر کے نام اہم ہیں۔ یہ وہ شعرا ہیں جو دہلی سے ترک وطن کر کے لکھنؤ پہنچے تھے۔

مصحفی (1747/50-1824/25) : ان کا نام شیخ غلام ہمدانی تھا۔ اصلاً امر وہہ کے رہنے والے تھے۔ تلاش معاش کے سلسلے میں مختلف شہروں کا سفر کیا۔ آنولہ، ٹانڈہ (بریلی)، دہلی وغیرہ میں مقیم رہنے کے بعد بالآخر لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کے ملازم ہوئے۔ سلیمان شکوہ کے دربار سے انشاء اللہ خاں انشا کی وابستگی کے بعد انشا اور مصحفی میں ٹھن گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو کم تر ثابت کرنے پر ٹٹل گئے۔

مصحفی نہایت پُرگو شاعر تھے۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اردو کے آٹھ دواوین کے علاوہ ایک دیوان قصائد اور متعدد مثنویاں ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ہیں۔ ان کی شاعری میں دہلوی اور لکھنوی دونوں رنگ شامل ہیں۔ انھوں نے فارسی میں بھی تین دیوان مرتب کیے اور شعرائے فارسی واردو کے تین تذکرے بھی لکھے۔ خلیق، آتش، اسیر وغیرہ ان کے قابل ذکر شاگرد ہیں۔ مصحفی کے یہاں ہر رنگ کے شعر مل جاتے ہیں۔

چلی بھی جا بجز غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلہ نو بہار ٹھہرے گا
ترے کوچے اس بہانے مجھے دن کو رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اُس سے بات کرنا
خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا، کیا تھا
مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

جرأت (1748/49-1809/10) : ان کا نام شیخ یحییٰ امان قلندر بخش تھا۔ ان کے آباؤ اجداد مغلیہ دربار سے وابستہ تھے۔ دہلی کے حالات خراب ہوئے تو جرأت ترک وطن کر کے پہلے فیض آباد، پھر لکھنؤ پہنچے۔ اُن دنوں لکھنؤ میں مرزا

سلیمان شکوہ شعرا کی سرپرستی کرنے والوں میں سرفہرست تھے۔ جرأت بھی سلیمان شکوہ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔

جرأت کے بارے میں مشہور ہے کہ عین جوانی میں نابینا ہو گئے تھے۔ اُن کی تعلیم تو معمولی تھی لیکن زبان پر انھیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ علم نجوم اور فنِ موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ ستار بہت عمدہ بجاتے تھے۔ زندہ دل تھے۔ ان کی شاعری ان کی زندہ دلی کی مظہر ہے۔ معاملاتِ عشق کے بیان میں وہ نہایت بے باک تھے۔ اپنے استاد جعفر علی خاں حسرت دہلوی کی طرح انھوں نے بھی معاملہ بندی کی راہ اختیار کی۔ انھوں نے مرثیے، مثنویاں اور قطعے بھی کہے لیکن غزل ان کا خاص میدان ہے۔ جرأت نے واسوخت، شہر آشوب اور ریختی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

آئے جو مرے پاس تو منہ پھیر کے بیٹھے
یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا
پری سا جو مکھڑا دکھا کر چلے
مجھے تم دوانہ بنا کر چلے
باتوں سے کٹے کس کی بھلا راہ ہماری!
غربت کے سوا کوئی نہیں ہم سفر اپنا

انشا (1752/56-1817): ان کا نام انشاء اللہ خاں تھا۔ وہ مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماشاء اللہ خاں کے ساتھ 1779 کے آس پاس لکھنؤ پہنچے۔ پھر دہلی میں شاہ عالم کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ انشا بڑے صاحبِ علم و فضل تھے۔ انھیں کئی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ وہ بہت ذہین، بے باک اور حساس تھے۔ سولہ سترہ برس دہلی میں گزارنے کے بعد لکھنؤ چلے گئے اور وہاں کی ادبی فضا پر چھا گئے۔ جرأت و مصحفی کے ساتھ انشا کے معرکے بھی قابلِ ذکر ہیں۔ انشانہ صرف دربار کی جان تھے بلکہ ان کا شمار اپنے عہد کے اہم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔

انشا نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ غزل میں انھیں امتیاز حاصل تھا۔ فارسی کلیات کے علاوہ ان کی کتاب 'دریائے لطافت' سے ان کے علم و فضل کا پتا چلتا ہے۔ 'رانی کیتکی کی کہانی' اور 'سبک گہر' ان کی مختصر داستانیں ہیں۔ رانی کیتکی کی کہانی میں انشانے یہ اہتمام کیا ہے کہ عربی فارسی کا کوئی لفظ نہ آنے پائے۔ ریختی میں بھی ان کا ایک دیوان موجود ہے۔ طبیعت کے اس رجحان کے باوجود مشکل پسندی، عالمانہ خیال آرائی، سنگلاخ زمینیں اور تراکیب بھی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ انھوں نے ہندی کے سبک و شیریں الفاظ کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
 نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
 بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
 بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا!
 تجھے اٹھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
 زناکت اس گلِ رعنا کی دیکھیو انشاء
 غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دوچار بیٹھے ہیں
 نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

رنگین (1758/63-1834/35) : ان کا نام سعادت یار خاں تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ مگر زیادہ تر وقت لکھنؤ اور دوسرے شہروں میں گزرا۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ ان کے مزاج میں شوخی تھی جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔

رنگین عیش و عشرت کی زندگی کے دلدادہ تھے۔ 'مجالسِ رنگین' ان کی مشہور کتاب ہے جس میں انھوں نے اپنے دور کی ادبی مجلسوں اور مشاعروں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ 'امتحانِ رنگین' بھی ان کی معروف کتاب ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور دوسری شعری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ کہا جاتا ہے شمالی ہند میں ریختی کہنے والے پہلے شاعر رنگین ہیں۔ ریختی میں عورتوں کے خاص محاورے، فقرے اور ان کے روزمرہ کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے۔ رنگین نسوانی زبان کا خوش اسلوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ 'سلطانِ ٹپوشہید' کے عنوان سے ان کا ایک قصیدہ بھی مشہور ہے۔ غالب کے معاصر شاہِ نمگین گوالیاری، رنگین کے شاگرد تھے۔

جو ہونی تھی سو بات ہولی گہارو
 مجھے چپکے پہنچا دو انشا کے گھر تک
 چلو لے چلو میری ڈولی گہارو
 نہ پوچھو کہ گے پیسے ڈولی گہارو
 میں ترے صدقے، نہ رکھ اے میری پیاری روزہ
 بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

شاہ نصیر (1760/61-1838) : شاہ نصیر کا وطن دہلی تھا۔ ماں باپ کے اکلوتے تھے۔ ناز و نعمت میں پرورش ہوئی، اس لیے تعلیم ادھوری رہ گئی۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ شاہ محمدی مآل سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ انھوں نے لکھنؤ کے کئی سفر کیے۔ یہاں آتش و ناسخ سے مشاعروں میں معرکہ آرائیاں بھی رہیں۔ وہ یہاں کے مشاعروں پر اثر انداز بھی ہوئے اور ان کے رنگِ سخن سے متاثر بھی۔ آخر میں وہ حیدرآباد چلے گئے تھے۔ وہیں

وفات پائی۔

شاہ نصیر کے کلام میں خارجیت، تصنع اور رعایت لفظی کا عنصر زیادہ ہے۔ انھیں مشکل زمینوں میں شعر کہنے کا ملکہ تھا۔ ذوق، مومن اور ظفران کے مشہور شاگرد ہیں۔

تیرہ بختانِ ازل کا کبھی دیکھا نہ فروغ
شب کو جگنو کی طرح اڑ کے نہ جھلکی مکھی
شیشہ بادہ گل رنگ پٹک دے ساقی
جامہ سبز میں دیکھے جو تن سرخ ترا
خیال زلفِ بتاں میں نصیر پٹا کر
گیا ہے سانپ نکل، اب لکیر پٹا کر

دوسرا دور

لکھنؤ میں شاعری کا دوسرا دور ان خصوصیات اور رجحانات سے عبارت ہے جو لکھنوی تہذیب و ثقافت کی بنیادی پہچان تصور کیے جاتے ہیں۔ لسانی طرح داری ہو یا تصنع اور صنائع کا زور یا پھر طرز ادا اور فکر و خیال کی نیرنگی، ہر دو سطح پر اس دور میں لکھنؤ کی انفرادیت نمایاں ہو کر سامنے آئی۔ اس دور کے نمائندہ شعرا میں آتش، ناسخ، شوق اور نسیم وغیرہ کے نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اس دور کی شاعری میں غزل کے علاوہ مثنوی کو خصوصی فروغ حاصل ہوا۔

آتش (1768-1847) : ان کا نام خواجہ حیدر علی تھا۔ ان کے والد خواجہ علی بخش دہلی چھوڑ کر فیض آباد میں بس گئے تھے۔ آتش فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں ہی یتیم ہو جانے کی وجہ سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ نواب محمد تقی خاں، ہوس کے یہاں ملازم ہو گئے۔ انھیں کے ہمراہ فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے۔ لکھنؤ میں مصحفی کی شاگردی اختیار کی لیکن کسی بات پر خفا ہو کر رشتہ توڑ لیا۔

آتش کے مزاج میں قناعت تھی۔ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ دربار سرکار سے ربط ضبط انھیں پسند نہ تھا۔ مفلسوں اور محتاجوں سے ان کی خوب بنتی تھی۔ ان کی شاعری میں لکھنوی طرز نمایاں ہے۔ انھوں نے صنعتوں سے خوب کام لیا ہے اور جذبات و احساسات کو بھی بڑے سلیقے سے نبھائے ہیں۔ ان کے یہاں اخلاقی مضامین اور مسائلِ تصوف کے ساتھ ساتھ بلند خیالی اور حسن بیان بھی ہے۔ درج ذیل اشعار سے ان کے رنگِ سخن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا؟
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟

سن تو سہی! جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟ کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا؟
آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے میں جا ہی ڈھونڈتا تیری محفل میں رہ گیا

ناسخ (1772/76-1838): ان کا نام شیخ امام بخش تھا۔ ناسخ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ وہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ ناسخ زبان داں اور ماہر فن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا شمار لکھنؤ کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ کئی امرا ان کے شاگرد تھے۔ ناسخ نہایت خود دار انسان تھے۔ وہ کبھی کسی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے۔ غازی الدین حیدر نے انھیں 'ملک الشعرا' کا خطاب دے کر دربار سے منسلک کرنا چاہا تو ناسخ نے جواب دیا کہ اتنے چھوٹے سے بادشاہ سے خطاب لے کر کیا کروں گا۔ غازی الدین حیدر کو غیر متوقع جواب دینے کے بعد ناسخ بادشاہ کے عتاب کے خوف سے لکھنؤ چھوڑ کر کچھ دنوں کے لیے الہ آباد چلے گئے۔ نظام دکن کے دیوان مہاراجا چند لال نے ناسخ کو حیدر آباد آنے کی دعوت دی، لیکن انھوں نے وہاں جانا بھی گوارا نہ کیا۔

ناسخ شاعری کے معنوی حسن سے زیادہ ظاہری حسن کے دلدادہ تھے۔ اس لحاظ سے اردو زبان کو نکھارنے اور سنوارنے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے تین دیوان اور دو مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔

زندگی زندہ دلی کا ہے نام مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں
وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں
جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

شوق (1782-1871): ان کا نام تصدق حسین خاں اور نواب مرزا عرفیت تھی۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ سے مختلف علوم میں مہارت حاصل کی۔ علم طب پر بھی انھوں نے مکمل دسترس بہم پہنچائی اور طبابت کو بہ طور پیشہ اختیار کیا۔ واجد علی شاہ کے عہد حکومت میں وہ شاہی معالج بھی مقرر ہوئے۔

شعرو سخن سے دلچسپی کے باعث شوق شاعری کی طرف راغب ہوئے اور آتش کی شاگردی اختیار کی۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن انھیں شہرت مثنوی نگار کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔ ان کی مثنویاں فریب عشق، بہار عشق، اور زہر عشق، کافی مقبول ہوئیں۔ ان تینوں مثنویوں میں 'زہر عشق' نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔

زہر عشق کا پلاٹ سیدھا سادہ ہے۔ واقعات و کردار عام زندگی سے لیے گئے ہیں اور انھیں سیدھے سادے انداز میں روزمرہ کی بول چال میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں لکھنؤ کی بیگماتی زبان کے بڑے اچھے نمونے نظر آتے ہیں۔ قصہ اتنے دلچسپ پیرایے میں بیان کیا گیا ہے کہ واقعات کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ کرداروں کے جذبات بڑے کامیاب اور مؤثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان امتیازات کے علاوہ لکھنوی تہذیب و معاشرت کی سچی تصویر کشی بھی اس مثنوی کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ 'زہر عشق' کے چند اشعار دیکھیے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے
عشق میں ہم نے یہ کمائی کی دل دیا، غم سے آشنائی کی
حشر تک ہوگی پھر یہ بات کہاں ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں

نسیم (1811-1845) : ان کا نام پنڈت دیانشر تھا۔ وہ گنگا پرشاد کول کے بیٹے اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ خاندانی روایت کے مطابق انھوں نے اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بیس برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ آتش کی شاگردی اختیار کی تھی۔ نسیم نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا ایک مختصر سادیوان ہے جس میں غزلوں کے علاوہ چند مخمس اور ترجیع بند بھی ہیں، لیکن ان کی ساری شہرت ان کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' سے ہے۔

نسیم کی غزلوں میں ان کے استاد کا رنگ جھلکتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور خودداری ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ان کی زبان پر لکھنوی رنگ غالب ہے۔ رعایتِ لفظی اور صنائع کے استعمال کے باوجود معنویت اور پاکیزگی کا خیال رکھنا ان کا خاص وصف ہے۔ کلام میں برجستگی اور اختصار سے خوبی پیدا کر دیتے ہیں۔

مثنوی 'گلزارِ نسیم' 1838/39 میں لکھی گئی اور 1844 میں شائع ہوئی۔ اس میں جو کہانی بیان ہوئی ہے، وہ قصہ 'گل بکاولی' کے نام سے مشہور ہے۔ اس مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ داستان میں غزل کے اشعار جیسا ایجاز پیدا ہو گیا ہے۔ 'گلزارِ نسیم' میں تشبیہ و استعارہ کی کثرت، لفظی و معنوی رعایات اور کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ دینے کے ہنر نے ایسا جادو جگایا کہ چھوٹی سی کہانی میں مختلف معنوی امکانات پیدا ہو گئے۔ یہ خوبی غزل کے عمدہ شعر میں ہوتی ہے۔

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کو دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کا مثالی نمونہ کہا جاتا ہے۔ نسیم کے زمانے کے لکھنؤ اور وہاں کی شاعری میں جوشائستگی، مرصع کاری اور تکلفات رائج تھے، وہ اس مثنوی میں پوری طرح جلوہ گر ہیں۔ چند اشعار درج ذیل ہیں۔

گل کا جو الم چمن چمن ہے یوں بلبلِ خامہ نعرہ زن ہے
 گل چیں نے وہ پھول جب اڑایا اور غنچہ صبح کھل کھلایا
 وہ سبزہ باغِ خواب آرام یعنی وہ بکاؤلی گل اندام
 جاگی مرغِ سحر کے غل سے اٹھی نکلت سی فرشِ گل سے
 منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی پُر آب وہ چشمِ حوض پائی
 دیکھا، تو وہ گل ہوا ہوا ہے کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
 گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل! جھنجھائی کہ کون دے گیا جل
 ہے ہے مرا پھول لے گیا کون! ہے ہے مجھے خار دے گیا کون!
 ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے بو ہو کے تو گل اڑا نہیں ہے
 نرس! تو دکھا کدھر گیا گل؟ سوسن! تو بتا کدھر گیا گل؟
 سنبل! مرا تازیانہ لانا شمشاد! انھیں سولی پر چڑھانا

تیسرا دور

اردو میں مرثیہ گوئی کی روایت:

دبستانِ لکھنؤ کے تیسرے دور کی شاعری کا امتیازی وصف مرثیہ نگاری ہے۔ اس دور میں مرثیہ نگاری نے سب سے زیادہ ترقی کی۔ مرثیہ نگاروں کے حوالے سے جن شعرا کو بقائے دوام حاصل ہوئی ان میں میر انیس اور مرزا دبیر کے نام سب سے زیادہ اہم ہیں۔

اردو مرثیے کی شروعات دکن سے ہوئی۔ شمالی ہند میں مرزا محمد رفیع سودا اور میر تقی میر نے اس میں کامیاب تجربے کر کے اس صنف کو اور ترقی دی۔

میر مستحسن خلیق، میر مظفر حسین ضمیر اور مرزا جعفر علی فصیح نے مرثیے کو ترقی کی اعلیٰ منزلیں طے کرائیں۔ بالخصوص مرثیے کے مختلف اجزائے ترکیبی میں تمہید، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین کالین میر ضمیر ہی سے منسوب ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ لکھنؤ میں اس صنف نے شاعری میں توازن پیدا کیا اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی ترجمانی کی۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے عہد میں یہ صنف اپنے درجہ کمال کو پہنچی اور بعد میں آنے والے مرثیہ گوئیوں نے اسی طرز اور ترتیب کی پیروی کی۔

میر انیس (1802/03-1874): ان کا نام میر بمر علی تھا۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ میر حسن کے پوتے تھے۔ میر انیس کے والد میر مستحسن خلیق بھی ایک باکمال شاعر تھے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے اور آخر عمر تک وہیں رہے۔

میر انیس نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن جلد ہی مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کے مرثیے فصاحت و بلاغت کی عمدہ مثال ہیں۔ میر انیس کو منظر نگاری، کردار نگاری اور رزم نگاری میں کمال حاصل تھا۔ واقعات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے نادر تشبیہیں، دلکش استعارے، آسان زبان اُن کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ میر انیس کی زبان عام فہم ہونے کے باوجود شگفتہ اور دلکش ہے۔

میر انیس نے مرثیے کے علاوہ غزلیں، رباعیاں اور سلام بھی کہے ہیں۔ اُن کے مراثری پانچ جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ زبان و بیان کی مختلف خصوصیات کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کی ترجمانی اور مقامی تہذیب کی عکاسی نے ان مرثیوں کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔ ان کے مرثیے کے کچھ بند درج ذیل ہیں۔

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں، وہ بیاباں وہ سحر
اوس نے فرشِ زمرد پہ بچھائے تھے گہر
دم بہ دم جھومتے تھے، وجد کے عالم میں شجر
لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پر نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

وہ دشت، وہ نسیم کے جھونکے، وہ سبزہ زار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے، شاخوں کا بار بار
پھولوں پہ جا بہ بجا، وہ گہر ہائے آبِ دار
بالائے نخل ایک جو بلبل، تو گل ہزار
خواہاں تھے نخل گلشنِ زہرا جو آب کے
شبم نے بھر دیے تھے، کٹورے گلاب کے

مرزادبیر (1803-1875) : ان کا نام مرزا سلامت علی تھا۔ دبیر کے اجداد ایران سے آئے تھے۔ یہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر میں اپنے والد مرزا غلام حسین کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے۔ وہیں کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ عربی، فارسی کے علاوہ دیگر علوم میں بھی مہارت حاصل کی۔

مرزادبیر کو شعر گوئی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ لکھنؤ کے ماحول نے اس شوق کو تیز تر کر دیا۔ وہ میرضمیر کے شاگرد تھے۔ لطیف تشبیہوں، دلاویز استعاروں اور صنائع بدائع کی فراوانی نے مرزادبیر کے کلام کو ایک انفرادیت بخشی۔ مضمون آفرینی اور مبالغہ آرائی میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے مرثیوں میں فضائل اور رزم کے حصے پر شکوہ اور ماتم اور بین کے حصے اثر انگیز ہیں۔

مرزادبیر نے رباعی، قطعہ، مثنوی، سلام اور قصیدے بھی کہے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت تھی۔ 'حسن القصص' اور 'معراج نامہ' ان کی دو مثنویاں ہیں۔ ان کا کلام 'دفتر ماتم' کے نام سے بیس جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

مرثیے کے دو بند ملاحظہ ہوں:

کس شیر کی آمد ہے، کہ رن کانپ رہا ہے رستم کا جگر، زیر کفن کانپ رہا ہے
ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے سب ایک طرف، چرخ گہن کانپ رہا ہے
شمیر بکف دیکھ کے، حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں، سمیٹے ہوئے ہوئے پر کو

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی پنہاں درازی پر طاؤسِ شبِ ہوئی
اور قطعِ زلفِ لیلیٰ زہرہ لقب ہوئی مجنوں صفتِ قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخِ ہنر مند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہو گیا، پیوند کے لیے

انیس و دبیر کے بعد نفیس، عشق اور رشید نے بھی مرثیے لکھے، مگر وہ ان دونوں کے برابر نہ پہنچ سکے۔ حالی اور ان کے بعض معاصرین نے عام ڈگر سے ہٹ کر شخص مرثیہ نگاری کی داغ بیل ڈالی جسے رفتہ رفتہ خاصا فروغ حاصل ہوا۔ مرثیے کے علاوہ سلام نگاری میں بھی اسی دور میں ایک نیا تجربہ کیا گیا، چنانچہ اہل بیتؑ کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کو مخاطب کرتے ہوئے سلام لکھے گئے۔